OPEN ACCESS
Al-Nasr
ISSN (Online): 2958-9398
ISSN (Print): 2959-1015
https://alnasrjournal.com

ڈاکٹر علی شریعتی کے مذہبی اور سیاسی تصورات: ایک تعارفی جائزہ

Dr. Ali Shariati's Religious and Political Concepts: An Introductory Review

Hafiz Muhammad Bilal

EST arabic govt. amratser high school shamaspura link ravi road lahore.

Abstract

This article presents an analytical study of the life, intellectual activities, and religious and political views of Dr. Ali Shariati. Ali Shariati (1933–1977) was a prominent Islamic thinker in Iran whose intellectual formation was influenced by his family's religious background, the academic environment of Mashhad, his exposure to Western philosophy, and the writings of revolutionary thinkers such as Franz Fanon. His early education in Mashhad and his observation of social inequalities fostered a tendency toward social justice in his thought, while his association with the liberation movements during his stay in Paris solidified his revolutionary ideology. After his return to Iran, his lectures at the Hosseiniya Irshad created intellectual awareness among the younger generation, and his opposition to the state made him a symbol of intellectual resistance. Shariati's religious and political views are based on the centrality of monotheism to the intellectual, social, and moral organization of the individual and society.

Keywords: Dr. Ali Shariati, Western philosophy, Islamic Traditions, Religious Interpretation, Symbolism in Scripture, Literal vs. Metaphorical

CC BY

مصنف کا تعارف

علی شریعتی 1933 میں شمال مشرقی ایران کے علاقے سبزوار کے نواحی قصبے مازینان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک مذہبی مولوی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد، محمد تقی، ایک استاد اور اسلامی سکالر تھے۔ 1947 میں انہوں نے صوبہ خراسان کے شہر مشہد میں "اسلامی سچائیوں کی تبلیغ کا مرکز" قائم کیا، جو ایک سماجی اسلامی پلیٹ فارم تھا اور 1950 کی دہائی میں تیل کی قومی تحریک کا حصہ بنا۔ شریعتی کی والدہ کا تعلق مشہد کے قریب سبزوار کے ایک چھوٹے زمیندار خاندان سے تھا۔ مشہد کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں اپنے تعلیمی دور میں، شریعتی نے معاشرے کے کم مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں سے رابطہ کیا اور پہلی بار ایران میں موجود غربت اور مشکلات کا مشاہدہ کیا۔ اسی دوران وہ مغربی فلسفی اور سیاسی افکار کے مختلف پہلوؤں سے بھی متعارف ہوئے۔ انہوں نے مسلم معاشروں کو درپیش مسائل کو روایتی اسلامی اصولوں کی روشنی میں جدید سماجیات اور فلسفے کے نظریات کے ساتھ جوڑ کر حل کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں مشہد کے روزنامہ خراسان میں ان کے مضامین ان کی ترقی پذیر اجتماعیت، جدیدیت پسندانہ سوچ، اور جمال الدین افغانی، علامہ محمد اقبال جیسے مفکرین اور سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات سے واقفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

1952 میں، علی شریعتی نے ہائی اسکول میں تدریس شروع کی اور اسلامک اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی، جس کی وجہ سے ایک مظاہرے کے بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ 1955 میں، انہوں نے مشہد یونیورسٹی سے بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔ 1957 میں، ایرانی پولیس نے انہیں قومی مزاحمتی تحریک کے دیگر سولہ اراکین کے ہمراہ دوبارہ گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد، شریعتی نے ایرانی اسکالر گلبرٹ لازارڈ کی رہنمائی میں پیرس یونیورسٹی میں اپنی گریجویٹ تعلیم کے لیے اسکالرشپ حاصل کی۔ انہوں نے 1964 میں فارسی زبان میں پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد پیرس چھوڑا۔ پیرس میں قیام کے دوران، شریعتی نے 1959 میں الجزائر کی نیشنل لبریشن فرنٹ (FLN) کے ساتھ کام شروع کیا۔ اگلے سال، انہوں نے فرانز فینون کی تصانیف پڑھنا شروع کیں اور ان کے کام کی ایک فارسی انتھالوجی کا ترجمہ کیا۔ شریعتی نے فینون کی فکر کو ایرانی انقلابی حلقوں میں متعارف کروایا۔ 17 جنوری 1961 کو، وہ پیٹریس لومومبا کی یاد میں منعقدہ ایک مظاہرے کے دوران پیرس میں گرفتار ہوئے۔

اسی برس، انہوں نے ابراہیم یزدی، مصطفی چمران، اور صدیق قطب زادہ کے ساتھ مل کر بیرون ملک ایران کی آزادی کی تحریک قائم کی۔ 1962 میں، انہوں نے پیرس میں سماجیات اور مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ جاری رکھا اور اسلامی اسکالر لوئس میسائنن، جیک برک، اور ماہر عمرانیات جارجز گوروچ کے کورسز میں شرکت کی۔ اسی دوران ان کی ملاقات فلسفی ژاں پال سارتر سے ہوئی اور انہوں نے جلال الاحمد کی کتاب "غربزدگی" (Occidentosis) کو ایران میں شائع کیا۔

شریعتی اس کے بعد 1964 میں ایران واپس آئے، جہاں انہیں فرانس میں تخریبی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ انہیں چند ہفتوں کے بعد رہا کر دیا گیا، جس وقت انہوں نے مشہد یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کیا۔ اس کے بعد، شریعتی تہران چلے گئے، جہاں انہوں نے حسینیہ ارشاد انسٹی ٹیوٹ میں لیکچر دینا شروع کیے۔ ان کے لیکچرز طلباء میں انتہائی مقبول ہو گئے اور معاشرے کے مختلف طبقات، بشمول متوسط اور اعلیٰ طبقے، میں زبانی طور پر پھیلنے لگے، جس سے ان کی تعلیمات کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی بڑھتی ہوئی کامیابی نے ایک بار پھر حکومت کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی، جس نے انہیں اور ان کے متعدد طلباء کو گرفتار کر لیا۔ عوامی دباؤ اور بین الاقوامی ردعمل کے نتیجے میں، بالآخر 20 مارچ 1975 کو اٹھارہ ماہ کی قید تنہائی کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔

شریعتی کو انگلینڈ جانے کی اجازت دی گئی۔ کچھ عرصے بعد، 18 جون 1977 کو، وہ ساؤتھمپٹن میں اس مکان میں مردہ پائے گئے جسے وہ نفسیات کے پروفیسر ڈاکٹر بٹرورتھ سے کرائے پر لیے ہوئے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں شاہی دور کی ایرانی سیکورٹی سروس، ساواک نے قتل کیا۔ تاہم، علی رہنیا کی سوانح حیات کے مطابق، ان کی موت پراسرار حالات میں دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی، جبکہ اس حوالے سے کوئی ہسپتال یا طبی ریکارڈ دستیاب نہیں ہوا۔ شریعتی کو دمشق میں پیغمبر اسلام حضرت محمد کی نواسی اور حضرت علی کی بیٹی سیدہ زینب کے قریب دفن کیا گیا ہے، جہاں ایرانی زائرین اکثر حاضری دیتے ہیں۔

ڈاکٹر علی شریعتی کے مذہبی وسیاسی نظریات

جو عالم اسلام میں فکری بیداری اور ذہنی انقلاب کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کے نظریات و عقائد کے مطالعے سے مغربی فکر و تہذیب کے تناقص و تضادات کو سمجھنے، پرکھنے اور بیان کرنے کی بے مثال صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور کفر و شرک اور مغربی فکری و ثقافتی یلغار کے مقابلے میں اسلام کے حیات بخش نظریات کو پیش کرنے میں مدد ملتی ہے۔ شریعتی کے مطابق عقیدہ صرف عقیدہ نہیں بلکہ عقیدہ معاشرے کی ضرورت ہے۔ سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے درست عقائد ناگزیر ہیں۔

در اینجا من نمی خواهم با اثبات وجود خدا یا توحید خدا بپردازم بلکه مقصودم این است که نشان بدهم که خدا از نظر انسان یک احتیاج شدید هم فلسفی و هم عاطفی است۔[1]

الله نه یهوده نه مسیح نه وشنو نه زؤوس و اهورامزدا، رب العالمین است.[2]

اللہ، نہ یہوہ ہے، نہ مسیح، نہ وشنو ہے، نہ زؤوس و اھورامزدا، (بلکہ) وہ رب العالمین ہے۔ شریعتی کے خیال میں انسان کا توحید تک کا سفر، سفر تکامل ہے کہ تاریخ بشر توحید تک پہنچی ہے۔ اس کے لئے فلسفی توجیہ یا کلامی تاویل کی ضرورت نہیں۔ بلکہ واضح ہے بت پرست چند خداؤں بلکہ کئی خداؤں کے قائل ہیں۔ عیسائیت کے لئے سالہا سال سے یہ معمہ قابل حل ہے کہ تین میں سے ایک یا ایک تین میں ہے ایک خدا، تین ممتاز و مشخص ذوات میں سے والد، بیٹا، روح القدس، یہ تینوں ذوات ممتاز و شخص ہیں اس کے باوجود خدا ایک ہے اور زرتشت میں دو خدائی کا نظریہ یعنی خدائے خیر و خدائے شر کا نظریہ۔ الہامی مذاہب میں بت پرستی کی بجائے شخصیت پرستی نے جگہ لے لی۔ مثلاً یہودیت میں موسیٰ پرستی اور عیسائیت میں عیسیٰ پرستی یعنی توحیدی مذاہب میں شرک نے پیغمبر پرستی کی صورت میں ظہور کیا۔ پیغمبر اکرم کے نام کے ساتھ عبدہ نے اسلام میں پیغمبر پرستی کے شرک کا قلع قمع کر دیا۔[3]

چه خوش اند آن سه فیلسوف زرنگ چه خوب مشکلشان را انتخاب کردند و چه زود هم حل کردند و خیالشان راحت شد

من میاندیشم پس من هستم (دکارت)

من احساس میکنم پس من هستم (آندری ژید)

من عصیان میکنم پس من هستم (کامو)[4]

وہ تین ذہین و چالاک فلسفی کیا خوب تھے جنہوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی مشکل کا ادارک کیا اور پھر کتنی جلدی اسے حل کر کے فارغ البال ہو گئے۔ ڈکارٹ کہتا تھا۔ میں سوچتا ہوں لہذا، میں ہوں آندرے کا کہنا تھا "میں محسوس کرتا ہوں الہذا، میں ہوں اور البرٹ کامو کہتا تھا کہ میں گناہ کرتا ہوں لہذا میں ہوں۔ اور میں، میں نے اپنے آپ سے سوال کیا، میں کہاں ہوں؟ آیا دوسرے لوگ جانتے ہیں؟ (کہ وہ کہاں

ہیں؟) میں کیوں نہیں جانتا۔ کتنا وحشت ناک ہے میرے لئے کہ جس چیز کے پیچھے جاتا ہوں اسے نہیں پا سکتا، ہر چیز کو خود دیکھ سکتا ہوں خود نہیں ہوں۔ اگر کوئی پوچھے کہ یہ تمام اندیشے کس نے پیدا کئے ہیں؟ اگر میں ہوں تو ان تمام اندیشوں کو پیدا کرنے والے میں، کو کس نے پیدا کیا؟ اگر میں خود کو پالوں کہ میں فلاں ہوں تو اس جملہ میں متکلم میں کون ہے اس لئے تو کہا گیا ہے: "جو اپنے آپ کو پہچان لے وہ خدا کو پہچان لیتا ہے۔ میں زندگی گزار سکتا ہوں درآنحالیکہ یہ نہیں جانتا کہ خود کہاں ہوں؟ میں اور یہ آسمان یہ زمین یہ خالی فضا، یہ پر سکوت اور وسیع سایہ ایک فریب تو نہیں ہے۔ اے خدائے بزرگ تو کیا ہے اور کیا نہیں ہے، میں تیرا شدید حاجتمند ہوں صرف یہ حاجت ہے کہ تو ہے۔ اے لوگو! اس روز کہ میں یقین کرتا کہ اس جہان میں خدا نہیں ہے۔ میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی دل کی تاریک رات چھٹ گئی اور پاکیزہ مسرور صبح نمودار ہوئی۔ انتظار کی آنکھ نے ((کوئی)) ہے کو درک کر لیا۔ [5]

گویا شریعتی کہنا چاہتے ہیں کہ یہ خدا صرف خالق کائنات کے معنی میں نہیں ہے بلکہ معنی ہستی بھی ہے مفہوم کائنات بھی یہی ہے۔ یعنی کائنات اس کے بغیر بے معنی ہے۔ ایک بیہودہ وجود ہے، ایک خوبصورت مگر احمق چہرہ ہے، خدا معنی ہستی ہے، جہت ہستی ہے، اس کی وجہ سے زندگی کی تخلیق ہوئی، اس کی بدولت طبیعت زندہ ہے اس کی بدولت، مقصد، ارادہ، زندگی و کائنات ہے۔

خدا کے بغیر یہ کائنات ایک بے قیمت مردہ لاش، ایک پتھر، اور انسان خود بھی جو کہ اس کائنات کا ایک جزو ہے۔ اگر خدا اس کائنات میں نہ ہو تو یہ کائنات ویران خانہ ہے۔

گویا ان کے خیال میں اہم ترین مسئلہ جو توحید اسلام میں ہے وہ یہ ہے کہ توحید اصول اسلام میں ہے دوسرے اصول دین مثلاً نبوت و قیامت کی طرح نہیں ہے بلکہ توحید تمام عقائد کی بنیاد و اساس ہے۔ توحید تمام عقائد کی بنیاد ہے نہ کہ دوسرے عقائد کے ساتھ ایک عقیدہ اور یہ کہ توحید انفرادی و اجتماعی، مادی و معنوی زندگی کی بنیاد ہے۔

خدا جو کہ انفرادی و اجتماعی و مادی و معنوی زندگی کی بنیاد ہے وہ ہے کہاں۔ کس سمت میں ہے شریعتی اس سوال کا جواب بزبان قرآن مجید یوں دیتے ہیں:

قل لله المشرق والمغرب يهدي من يشاء الى صراط مستقيم۔[6]

ان بے خرد لوگوں سے۔۔۔ کہو! مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے اور وہی ہے کہ جو جسے چاہتا ہے راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔ اس لیے کہ خدا نہ شمال میں ہے نہ جنوب میں، نہ بیت المقدس میں ہے نہ کعبہ میں بلکہ عالم میں ہر جگہ ہے۔۔۔ معاشرہ میں، ہر اس جگہ جہاں لوگ ہیں ۔۔۔ اور یہ سب معنوی وابستگی کے لئے معیار ہیں, یہ ایک تلخ حقیقت ہے، جس کا انکار کسی تعبیر و توجیہ سے نہیں کیا جا سکتا کہ زمین کا وہ خطہ جہاں خدائے واحد پر ایمان مضبوط تر ہے اور جہاں خدا کی پرستش دنیا کے باقی تمام خطوں سے زیادہ ہوتی ہے وہ دنیا کا پست ترین اور پسماندہ ترین خطہ ہے اور خدا پر ایمان رکھنے والے زمین کے پھٹکارے ہوئے لوگ ہیں! بقول شمس (تبریز) کوئی شخص خدا کا اثبات کر رہا تھا! اس نے کہا حضرت، خدا کو تمہارے اثبات کی حاجت نہیں، تم خود اپنے آپ کو اثبات کرو!۔ [7]

ذات الٰہی وصفات الٰہی و جبر و اختیار:

اس قسم کی بحثوں کے متعلق شریعتی کا بنیادی موقف یہ ہے کہ اس قسم کی بحثوں میں الجھنے کی بجائے ہمیں ایک عملی مسلمان ہونا چاہیے یہ بحثیں ہمیں فلسفیانہ اور کلامی پیچیدگیوں میں الجھا سکتی ہیں مگر سماجی مسائل کا حل نہ صرف پیش کرنے سے قاصر ہیں بلکہ مزید سماجی مسائل اور پیچیدگیوں کا موجب بنتی رہی ہیں اور بن سکتی ہیں۔

یا پھر ہر کسی کی مشکل یہ ہے کہ خدا کی ذات کے ساتھ اس کی صفات کا رابطہ کیا ہے کہ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ تم سے اس کا کیا تعلق ہے، کیا تمہارا چوہے جتنا حقیر ذہن اس مسئلہ کو حل کر سکتا ہے؟ یا پھر ایک ہزار سال پرانی اس جبر و اختیار کی بحث جس میں پھر وہ بنی امیہ اور بنی عباس۔۔۔ اور ان کے وارثوں۔۔۔ کے کوڑوں تلے جان سے جاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ وہ گھٹن، بد بختی، اور پلیدی کے جبر میں غوطہ کھا رہے ہیں لیکن اختیار کے اثبات کے درپے ہیں وہ بھی زمین و زندگی میں نہیں بلکہ ہوا و آسمان و غیب اور قبل از خلقت میں ہم تہران کے ٹریفک اور بس سروس کے مسئلہ میں رہ گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ذات الٰہی میں جمع حدوث و قدم کو حل کریں۔

ایک حد تک ہم مجبور ہیں اور ایک حد تک مختار، مجبور اس طرح کہ جیسے ایک باغبان یا ماہر زراعت مجبور ہے کہ درختوں کی اصلاح اور پھولوں کی نشو و نما میں زراعت کے اصولوں کی پیروی کرے اور مختار ہے کہ جو پودا چاہے اپنے باغ میں کاشت کرے۔ اسے اختیار ہے کہ کم درجے کا پھل یا بد بودار پھول کاشت کرے یا بہترین پھل اور خوشبودار پھول کاشت کرے۔ عین اسی وقت وہ پودوں کی مخصوص نشو و نما کے قوانین کے سامنے مجبور ہے۔[8]

وہ اس کا یوں نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان معاشرے میں ایک حد تک مختار اور ایک حد تک مجبور ہے لا جبر ولا تفویض بل امر بین الامرین نہ مجبور نہ مختار بلکہ ان دونوں کے درمیان ہے۔ بالفاظ دیگر اختیار مقید، آزادی مشروط۔ انسان آزاد ہے کہ اپنی گاڑی کو جب اور جہاں چاہے لے جائے مگر مجبور ہے کہ جو مکینکل اصول ہیں ان کی پیروی کرے اور انہی کے مطابق چلائے۔

مشیت و ارادہ الٰہی:

شریعتی ایک سوال کے جواب میں کہ آیا خدا تمام امور میں دخیل ہے یا صرف امور خیر میں؟ کہتے ہیں۔

خدا درهیچ امری دخالت نمی کند، خدا درهمه اموردخالت دارد[9]

ترجمہ: خدا کسی کام میں دخالت نہیں کرتا، خدا تمام امور میں دخالت کرتا ہے۔

اسلام میں مشیت الٰہی سے مراد فطرت میں موجود قوانین ہیں۔ مشیت خدا سے مراد فطری قوانین کو توڑنا نہیں ہے۔ یعنی وہ درخت کو یہ نہیں کہتا کہ بڑا ہو، پھل دے بلکہ اس کا ارادہ ہے قانون تکامل کے عنوان سے کہ درخت کے اندر یہ تمام چیزیں پائی جائیں (گویا طبعی قوانین میں انسان مجبور محض ہے، لیکن شرعی قوانین میں) ہمیں اختیار ہے اگر احکام خدا کے مطابق عمل کریں تو گویا ہم نے مشیت خدا کی پیروی کی ہے اور اگر اس کے خلاف عمل کریں تو بزبان قرآن، ظالم کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

عقیدہ رسالت:

شریعتی کا رسالت پر استدلال بھی دوسرے عقائد کی طرح سماجی حوالے سے ہے۔ دنیا کے سماجی نظاموں، موجود مذاہب کو غور سے دیکھتے ہیں اور ایک واقعیت کہ اس وقت دنیا میں مختلف سماج بھی ہیں اور مختلف مذاہب بھی ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر سماج اور ہر مذہب انسانی ترقی و فلاح و بہبود کا خواہاں ہے۔ اسی طرح منطقی پیچیدگیوں اور مناظرانہ جدل کی بجائے موجودہ تسلیم شدہ حقائق کا ماحصل (انسانی تکامل کی ضرورت) کی تلاش میں ایک اور بھی واقعیت اور حقیقت ہے کہ انسانیت کو ایک ایسے دین کی ضرورت ہے جو ان کے تمام سماجی ضرورتوں اور بالآخر اخروی فلاح کا بندوبست کر سکے۔

چهره های نمایان تاریخ قیصر است و حکیم است وپیامبر۔

تاریخ کی تین نمایاں شخصیات ہیں : قیصر، فلاسفر اور پیغمبر۔[10]

دنیاوی حکمرانوں کا نمونہ وہ قیصر کو قرار دیتے ہیں جس کے تصور سے بے رحم، ناشائستہ اور خوفناک صورت ذہن میں ابھرتی ہے، دوسرے فلاسفر کہ ان کے بقول اگر دنیا کی لائبریریوں سے تمام عالمی فلاسفر کے افکار پر مبنی کتب کو ضائع کر دیا جائے تو دنیا میں موجود عام انسان کا کیا نقصان ہو گا؟۔ ان کے بقول عوام الناس کو اس سلسلے میں کسی طرح کا کوئی علمی نقصان تک محسوس نہ ہو گا۔ (بلکہ سماجی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے) بلاشبہ مغرب کے لئے افلاطونوں اور ارسطوؤں سے بھری ہوئی درسگاہوں سے زیادہ مفید اور سود مند عرب کے ایک بدو ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں) کیونکہ ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے افکار سماج کے لئے فلاسفر کے خیالات سے زیادہ مفید اور موثر ہیں)۔

تاریخ میں ایک اور واضح و روشن صورت ایک پیغمبر کی ہوتی ہے تاریخ کے پیغمبروں والے چہرے، ان کی گفتگو یا معیار اخلاق میں کتنا ہی فرق کیوں نہ پایا جاتا ہو، باہم بہت زیادہ مماثل ہوتے ہیں۔ ان کا چہرہ ہمیشہ جاذب نظر اور دوستانہ اخلاق کا مظہر ہوتا ہے۔ ان کے چہروں سے جاہ و جلال اور قوت سے زیادہ اخلاقی اعتبار صدق و خلوص سے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہم تاریخ انسانیت کی معراج تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر عوام الناس ان سادہ لوح چہروں کی پیغمبرانہ کیفیت کے اعتبار سے حیرت زدہ ہو کر پیروی کرتے ہیں۔ عوام الناس ان چہروں پر عاشقانہ نظریں جما کر پر اسرار قسم کی آگ میں جلتے ہوئے، موت کے لئے بے چین اور جانیں قربان کرنے کے لئے تیار نظر آتے ہیں۔[11]

شریعتی کی نظر تمام انسانیت اور ادیان عالم پر ہے وہ عالم انسانیت سے بات کرتے ہیں لہذا دنیا کے تمام موجودہ ادیان اور ان کے بانیوں کو مد نظر رکھ کر شریعتی انبیا علیہم السلام کو دو جماعتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

ا۔ غیر سامی انبیاء (ان کا تعلق، ایران، چین، ہندوستان سے ہے۔ یعنی آریائی نسل سے ہیں)

سامی یعنی سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تعلق رکھنے والے انبیاء علیہم السلام۔ پیغمبر اسلام اسی مؤخر الذکر جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ شریعتی کے مطابق آریائی نسل کے پیغمبروں میں سے زرتشت گوتم بدھ اور کنفیوشس کا ذکر کے ان کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں، بلاشبہ کنفیوشس کا مذہب، زرتشت اور زرنشت کا مذہب گوتم بدھ کی تردید کرتا ہے۔ کنفیوشس معاشرے کی، زرتشت خارجی زندگی کی اور گوتم بدھ داخلی زندگی کی بات کرتے ہیں۔ زرتشت کا دنیوی تخیل روشن اور گوتم بدھ کو دنیا تاریک نظر آتی ہے۔ ان تمام حقائق کے باوجود ایک ماہر عمرانیات کے لئے یہ اختلافات بلکہ تضادات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کے لئے ضروریات زندگی کی اقسام، آفات، ان ضروریات کے پورا کرنے کے طریقے، آفات کے موانع اور بالآخر دائرہ فکر، عالم احساس، خود نوع انسانی اور دینی معاشرے اہمیت کے حامل ہیں۔

شریعتی کے مطابق آریائی نسل کا تعلق امراء سے تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں: چینی مذہب کے بانی مہادیر، کا تعلق ۶۰۰ قبل مسیح کے سپہ سالاروں سے، گوتمبدھ بھی ساکیہ کے شاہی کھشتری خاندان سے، ہندوستان کے نئے مذہب سکھ کے بانی گرونانک کا تعلق کھشتری نسل کے شاہی خاندان، چین کے عظیم پیغمبر تاو عقیدہ کے بانی ساتویں صدی قبل مسیح کے بادشاہ لاہ ینگ کے دربار کے اہم عہدہ دار، کنفیوشش کا قدیم امراء خاندان لو (14) زرتشت ایک امیر زمیندار اور اہم آتش پرست کے بیٹے اور مانی کا تعلق بھی ایران کے امراء سے تھا، جبکہ دوسری طرف سامی نسل کے انبیاء علیہم السلام کا معاملہ ان سے بالکل برعکس ہے۔ ان کی اکثریت کا پیشہ جانوروں کو چرانا تھا۔ جبکہ بہت کم تعداد میں کاریگر، آرٹسٹ اور پیشہ ور تھے۔ جو قرون اولی کے ان تاریخی معاشروں سے تعلق رکھتے تھے جن کی معاشرے میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔

شریعتی کے نکتہ نظر سے غربت و افلاس کے باوجود ابراہیم علیہ السلام، نمرود جیسے مطلق العنان بادشاہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام پھٹے پرانے لباس میں ملبوس، ٹیڑھا میڑھا گڈریوں والا عصاء لے کر فرعون کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں اور بنی

اسرائیل کو غلامی سے نجات اور آزاد معاشرے کا قیام عمل میں لاتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام یکہ و تنہا بحیرہ قلزم کے ساحل پر ماہی گیری چھوڑ کر شہنشاہ روم کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں اور اپنے روحانی حملوں سے وحشی و آدم خور رومی شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

شریعتی رسول اکرم ﷺ کی معرفت حاصل کرنے کے لئے چند منتخب شخصیات کی سیرت و کردار کا مطالعہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جناب محمد مصطفی ﷺ کے رخ انور کے خطوط، جن کو غور سے ہماری کمزور آنکھوں کو چودہ طویل صدیوں کے بعد دیکھنا ہے، انہیں محض انہی کے چہرہ میں پڑھنا اور تلاش کرنا کافی نہیں بلکہ انہیں قدرت پروردگار، قرآن حکیم علی کرم اللہ وجہہ و ابوذر رضی اللہ عنہ اور دیگر بہت سے چہروں کے خدوخال میں مطالعہ کرنا ہوگا جو ان کے بہت سے دوسرے شاندار و وفادار پیروکاروں سے تعلق رکھتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ یہ خدوخال ہمیں ان کے دنیوی حیرت انگیز خاندان میں تلاش کرنا ہوں گے جن کے والد علی والدہ فاطمہ زہرا، بیٹے حسن و حسین اور بیٹی زینب ہیں۔

ختم نبوت:

پیغمبر اکرم ﷺ کی دو ذمہ داریاں تھیں۔ ایک پیغمبری، نبوت اور ابلاغ کی ذمہ داری، دوسری پیام کو عملی صورت میں لانا، یعنی انسانی معاشرے میں ایک مثالی امت کی تشکیل کے لئے کچھ لوگوں کی تربیت۔ چنانچہ آئیڈیالوجی اور مکتب و پیام ۲۳ سال کے عرصے میں خاتمیت تک پہنچ گیا اسی لیے جناب رسالتماب صرف خاتم النبیین ہیں اور: الیوم اکملت لکم دینکم کی منزل میں ان کی ذمہ داری ختم ہو گئی ہے۔ پس (پیغام رسانی اور انقلابی رہبر کے عنوان سے) پیغمبر اسلام ﷺ کی پہلی ذمہ داری اختتام کو پہنچی ہے اور اس پر خاتمیت کی مہر لگ گئی ہے۔

مزید وضاحت کے لئے ہم اسلام شناسی میں سے ختم نبوت کے سلسلے میں شریعتی کے جواب کو تحریر کرتے ہیں تا کہ ہم ان کے ختم نبوت کے نظریے سے مکمل طور پر آگاہ ہو سکیں، خوش قسمتی سے اس سوال کا جواب عظیم اسلامی فلسفی محمد اقبال نے دیا ہے۔ میں اس میں کچھ اضافہ کروں گا اور اپنا ذاتی نظریہ بھی بیان کروں گا کیونکہ میں خود اپنے نظریہ کا جوابدہ ہوں۔ جب آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں خاتم الانبیاء ہوں تو آپ ﷺ کی مراد اس سے یہ نہیں ہے کہ انسان کو ترقی و کمال کی ضرورت نہیں ہے بلکہ انسان کو ترقی و کمال کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی زندگی کو تعقل و تفکر سے اور تربیت سے کمال کی راہ پر گامزن کرے۔

> خوشبختانه پاسخ این سوال را فیلسوف بزرگ اسلامی محمد اقبال داده است. من چیزی به آن اضافه می کنم و همچنین دیدگاه شخصی خود را توضیح می دهم زیرا من مسئول دیدگاه خودم هستم. وقتی پیامبر اکرم صلی الله علیه و آله می فرماید من خاتم الانبیا هستم، منظورش این نیست که انسان نیاز به پیشرفت و کمال ندارد، بلکه انسان به پیشرفت و کمال نیاز دارد که باید.[12]
>
> در آنحالیکہ (ساتویں صدی عیسوی میں) تمدن یونان، تمدن روم، تمدن اسلام، قرآن، انجیل، تورات کے آنے کے بعد انسان کو جتنی مذہبی تربیت کی ضرورت تھی وہ ہو چکی (اس کے بعد انسان اس تربیت کی بنیاد پر) اپنی زندگی کو جاری رکھ سکتا ہے اور اسے مکمل کر سکتا ہے۔ اب انسان کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر زندگی گزارنی ہے اور اسے مکمل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ نبوت ختم ہے۔ اپنے لیے خود راستہ متعین کرتا ہے۔

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتے ہیں:

پیغمبر اسلام ﷺ فرماتے ہیں کہ تربیت کے بعد اور عقل کی اصلاح، تکامل اور درستگی کے بعد اب وہ اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ انسان اب عقل کی بنیاد پر زندگی گزار سکتا ہے اور مقاصد حیات کو سمجھ سکتا ہے۔ یعنی اب اس کا کمال اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ نئی وحی کی اسے

احتیاج نہیں رہی کہ وہ اسے قدم بہ قدم چلائے۔ گویا کہ اب عقل نے وحی کی جگہ لے لی ہے۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ عقل وحی کی بنیاد پر تربیت حاصل کر چکی ہے اور بالغ ہو چکی ہے۔ اجمالی طور پر تو شریعتی کے تمام عقائد کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا گیا ہے لیکن جہاں تک ان کے عقیدہ رسالت کا تعلق ہے اس میں سے ختم نبوت کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور اس موضوع پر باقاعدہ مکمل کتابیں بھی تحریر کی گئی ہیں۔ چنانچہ ہم اس موضوع کا آغاز سید مرتضی عسگری کے تند و تیز فتوی سے کرتے ہیں تا کہ اس حساس موضوع کی نزاکت کا اندازہ ہو سکے۔

علی شریعتی الکفر بخاتمیه سید الرسول والمحرف شریعت

ترجمہ: علی شریعتی سید المرسلین کی خاتمیت کا منکر اور آپ ﷺ کی شریعت میں تحریف کرنے والا۔

مزید وضاحت کے لئے ایک اور فتوی ملاحظہ کرتے ہیں۔ شریعتی کی کتابوں کے اجمالی مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے افکار مذہب تشیع کے مطابق نہیں ہیں اور وہ ختم رسالت اور ضروریات دین کے منکر ہیں۔ شریعتی میں شاعریت اور اس کی حساس روح ان کی شخصیت میں اعتدال پیدا نہیں ہونے دیتی تھی۔ مثلاً حضرت ابوذر کی جب اوصاف بیان کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ نعوذ باللہ ابوذر پیغمبر ﷺ سے ایک قدم آگے تھے۔ محقق ہونے سے زیادہ وہ شاعر تھے۔ مثلاً ایک اور مقام پر کہتے ہیں کہ ہم دنیا کی تمام صفات صرف ایک ہی شخصیت میں ڈھونڈ سکتے ہیں اور وہ ہے علی کرم اللہ وجہہ کی ذات جبکہ ایک مسلمان کو پیغمبر ﷺ کی پیروی کرنی چاہیے اور خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ پیغمبر ﷺ کے سامنے کس طرح تواضع وانکساری کرتے تھے۔

ڈاکٹر بہشتی کہتے ہیں جب میں نے شریعتی کو اس بارے میں متوجہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میرا مطلب یہ تھا کہ ہم لوگوں میں مختلف صفات پائی جاتی ہیں جبکہ حضرتعلی کرم اللہ وجہہ میں وہ تمام صفات اکٹھی پائی جاتی ہیں۔ یہ ناقص بات ہے اسلام کے رہبر اول پیغمبر ﷺ کی ذات ہے جن کا اخلاق عالی و بالا تھا اور ہم علی کرم اللہ وجہہ کو پیغمبر ﷺ کے معیار پر پورا اترنے کی وجہ سے اہمیت دیتے ہیں اور اسی طرح ہم سلمان، عمار، وغیرہ جیسے سب اصحاب رسول رضوان اللہ تعالی منھم کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی دو نقص شریعتی میں موجود تھے دشمنی کرے تو وہ بھی زیادہ اور محبت کرے اور مقام بلند کرے تو وہ بھی حد سے زیادہ۔ ڈاکٹر علی شریعتی کے نظریات پر یورپی تعلیم اور اساتذہ کا گہرا اثر تھا، جس کی وجہ سے ان کی باتوں میں کبھی تضاد آجاتا ہے۔ مخالفین ان خامیوں کو اچھال کر انہیں بدنام کرتے ہیں، جبکہ ان کے حامی ان کی ہر بات کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لیتے ہیں۔ تاہم، معتدل مفکرین ان کے خیالات کو متوازن انداز میں سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو ان کے نظریات کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔[13]

خلافت اور امامت

ان کا کہنا ہے کہ حضور اکرم نے اپنے آخری لمحات میں یہ چاہا کہ ایک وصیت لکھیں۔ یہ دیکھ کر بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور اس کے لکھنے میں مانع ہوئے۔ یہ دیکھ کر حضور اکرم نے یہ ارادہ ترک کیا۔ یہاں اگر واقعا" اس وصیت کے لکھنے پر خداوند عالم کی طرف سے مامور تھے تو یقینی اور حتمی طور پر لکھتے اور لوگوں کے اعتراض اور رکاوٹوں کو اپنے فرائض میں حائل ہونے نہیں دیتے۔ لیکن اس کے بعد چند مواقع ایسے ہیں جہاں ہم حضرت علی کو دیکھتے ہیں ثقیفہ بنی ساعدہ میں قائم ہونے والی خلافت پر اعتراض کرتے ہیں ان کی خلافت کو قبول نہیں کرتے لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے تسلیم کرتے ہیں۔ چاہے وجہ کچھ بھی آپ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف ہم فرض کریں کہ علی کی امامت بھی نبوت کی طرح اللہ کی طرفہ کا ایک عہدہ ہے تو کسی بھی صورت یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ کسی دوسرے کو یہ عہدہ دیا جائے اور علی کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ اس عہدے کو دوسروں کے حوالے کر کے خود سر تسلیم خم ہو جائے اور اسے قانونی پیچنوائے نبوت کوئی ایسا منصب نہیں کہ لوگ اسے کسی شخص کے حوالے کریں۔ اور نبی کوئی ایسا شخص نہیں جسے لوگوں نے منتخب کر کے بھیجا ہو۔[14]

اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر کا کام اور پیغمبر کی تحریک کسی ایسے جانشین کے ہاتھوں میں رہے جو خود پیغمبر کی جنس نوع حکومت اقتدار اور رسالت سے مربوط ہو۔ مثال کے طور پر کسی صوبے کا گورنر اپنے اقتدار تک عوام کے ذریعے پہنچتا ہے اور منتخب ہوتا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے تو لوگ کسی دوسرے کو منتخب کر کے اس کی جگہ بھیجتے ہیں۔ لیکن جب ایک استاد ایک خاص طرز فکر پیش کر کے اس کی جگہ خود اس کی طرح پڑھانے اسے خصوصی طور پر سمجھاتا ہے تو کوئی دوسرا اور سمجھانے کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ جنگ تبوک میں پیغمبر اکرم ۱۳ سال کی عمر میں لشکر کے ساتھ سخت اور پر پیچ راہوں کو عبور کرتے ہیں۔ صحراؤں کو طے کرتے اور رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے 400 کلو میٹر کا فاصلہ طے کرتے ہیں اس جنگ میں سب موجود ہیں۔ لیکن اسی علی کو گھر میں رہنے کی تاکید کی ہے چونکہ علی مرد میدان تھے، آزردہ ہوتے ہیں اور پیغمبر اکرم کے پاس پہنچ کر شکایت کرتے ہیں مجھے شہر میں رہنے کو کہا ہے اس لئے لوگ تنقید کرتے ہیں، اعتراض کرتے ہیں اور طعنے دیتے ہیں۔ لیکن پیغمبر اکرم بڑے اصرار کے ساتھ انہیں میدان جنگ جانے سے روکتے ہیں۔ سپاہیوں کے درمیان سے واپس بلا کر کہتے ہیں۔ میں نے تمہیں اس لئے شہر میں چھوڑا ہے تاکہ تم میری جگہ سنبھال سکو۔"

پیغمبر اکرم کے بعد تاریخ میں دو مرحلے تھے پہلا مرحلہ ایک خاص وقت تک نظر آتا ہے جہاں یکے بعد دیگرے پیغمبر اکرم کی آس میں سے بارہ افراد اسلامی معاشرے کی حکومت اور تاریخ اسلام کی رہبری اور اسلامی معاشرے کی تربیت پیغمبر اکرم کی وصیت اور تعین کے مطابق کریں۔ لہذا ہمیں یہ بات قبول کرنی چاہئے کہ ایک معاشرہ فقط دس سالوں میں تشکیل نہیں پاتا اس دوران صرف اس کے خدوخال واضح ہو جاتے ہیں اور اس کے افراد اس کے تہذیبی و تمدنی اعتبار سے مضبوط نہیں ہو پاتے۔ اسلامی معاشرہ تو وہ امت ہے جس کے ہر فرد کو چاہئے کہ وہ ایک مستقل انسان، قومی رائے رکھنے والا اور خود مستقل رائے رکھنے والا ہو۔ لہذا پیغمبر اکرم کو چاہئے تھا کہ ایک ایسا سلسلہ قائم کرتے کہ آپ کا دس سال والا کام دوسرے سو سال ڈیڑھ سو سال یا دو سو سال تک جاری و ساری رہتا تاکہ اسلامی معاشرے کا ہر فرد سیاسی شعور کی اس حد تک پہنچتا کہ بغیر کسی بیرونی اشارے کے اپنی رائے کا برملا اظہار کرتا اور رائے بھی درست دیتا۔

اگر پیغمبر اکرم کے بعد بنی امیہ اور بنو عباس کے خلفاء کے بجائے ائمہ اثنا عشری حاکم ہوتے، مثال کے طور پر یزید کی جگہ حسین حاکم ہوتے، معاویہ کی جگہ حسن حکمران ہوتے اور ابو العباس سفاح کی جگہ امام محمد باقر علیہ السلام ہوئے، مروان کی جگہ امام جعفر صادق علیہ السلام ہوتے یہ سلسلہ جاری رہتا اور ۲۵۰ سال تک اسلامی معاشرہ ان جیسی شخصیات کی رہبری میں گزار لیتا اور اس کے بعد انتخاب سے ہوتے تو زیادہ آسانی کے ساتھ عوام بہترین اسلامی شخصیات کو ووٹ کے ذریعے چن سکتے کیونکہ اس وقت معاشرے کے افراد کا سیاسی شعور مکمل ہو چکا ہوتا اور معاشرتی نشو و نما بھی کامل ہو چکی ہوتی۔ کاش ایسا ہوتا تو صرف ۳۰ سال کی مدت میں عوامی رائے کا جنازہ نہ نکل جاتا اور امیر معاویہ عوامی رائے کا گلا گھونٹ کر حکومت جمہوری کو ملوکیت میں تبدیل نہ کر سکتا اور نہ ہی یزید کو جانشین بنا سکتا۔ اس بارے میں میرا اعتراض صرف اور صرف میں ہے اور یہ میرا ذاتی عقیدہ ہے نہ تو مجھے بیعت و شوری پر اعتراض ہے اور نہ ہی جانشینی کے بارے میں ادنی سا شک ہے۔ جانشینی کا مسئلہ جیسا کہ اہل تشیع بھائی کہتے ہیں۔ ایک واقعیت ہے عقلی و منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حقیقت بھی ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا۔ اور بیعت و شوری بھی جیسا کہ ہمارے اہل سنت بھائی کہتے ہیں انسان شناسی اور حریت پسندی کے اعتبار سے ایک ترقی پذیر بنیاد ہے اور ایک ایسی بنیاد ہے جو اسلام میں موجود ہے اور پیغمبر کی سنت بھی یہی رہی ہے لیکن میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم کی وفات کے فورا بعد ثقیفہ بنی ساعدہ میں ہونے والے انتخابات کاش ۲۵۰ سال بعد ہو چکے ہوتے تو صرف تیس سال بعد جمہوریت کا گلا نہیں گھونٹا جا سکتا تھا۔[15]

جدت پسندی اور شریعتی

وہ تاجر کہ جس کا پیشہ قدیم ایام سے تجارت ہے اور وہ مثلاً اون، ریشم اور غلہ کا سوداگر ہے، اس بات سے واقف ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے اور اس کی تجارت موجودہ خطوط پر استوار نہیں ہے، پس وہ فوراً اپنی سرمایہ کاری کو تبدیل کر کے اس مارکیٹ سے نکل آتا ہے اور غیر ملکی مال کا ڈیلر بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اب قدیم کلاسک تجارت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ لیکن یہ آدمی کہ جو اپنے زمانے سے متعلق ایسی روشن آگاہی رکھتا ہے جب مذہبی مسائل پر آتا ہے تو قدامت پرست اور روایت پسند ہو جاتا ہے۔ ایک اور مقام پر شریعتی جدت پسندی اور روایتی انداز سے ہٹ کر عصری تقاضوں کے مطابق بحث کرنے کے حق میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اس طرح کا وعظ اس طرح کی تبلیغ، اب اس زمانے میں موثر نہیں۔ یہ غیر مذہبی، اور مذہب دشمن عناصر کی تبلیغاتی یلغار اور اس جدید علمی، ہنری اور فنی اسالیب اور موجودہ جدید سسٹم کی تدریسی، تبلیغی اور ارتباطی وسائل کے مقابل نہیں ٹھہر سکتی اور نہ ہی موثر طور پر اسلام کا دفاع کر سکتی ہے لہذا جدید ریڈیو سے استفادہ کریں۔[16] مندرجہ بالا گفتگو سے واضح و آشکار ہو چکا ہے کہ شریعتی نہ صرف یہ کہ روایتی انداز سے ہٹ کر گفتگو کرتے تھے بلکہ جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق گفتگو کرتے تھے اور روایتی انداز کی حوصلہ شکنی بھی کرتے تھے۔ تا کہ جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق علمی وراثت کو موثر انداز میں آگے بڑھایا جا سکے۔[17]

استعماریت:

شریعتی کے مطابق، استعمار کے خلاف سب سے مؤثر حکمت عملی "خود شناسی" یا اپنی تہذیبی اور دینی جڑوں کی طرف واپس لوٹنا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> استعمار کا سب سے بڑا ہتھیار یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کر دیتا ہے اور ہمیں ایسی شناخت عطا کرتا ہے جو اس کے مفادات کو پورا کرتی ہے۔ لہٰذا، استعمار کی شکست کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہم اپنی حقیقی شناخت کو پہچانیں اور اپنی تاریخ، دین، اور تہذیب کی بنیاد پر نئی زندگی کی تعمیر کریں۔

علی شریعتی اپنی کتاب میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید مقبوضہ اقوام کو مزید غلامی میں دھکیلتی ہے۔ ان کے بقول: بازگشت بہ خویشتن کا مطلب یہ ہے کہ ہم مغرب کی اندھی تقلید کو ترک کر کے اپنی ثقافت اور دین کے روحانی اصولوں کی بنیاد پر اپنی زندگی کا نیا نقشہ بنائیں۔[18]

حقوق نسواں:

علی شریعتی نے اپنی کتاب "فاطمہ فاطمہ ہے" میں حضرت فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) کی شخصیت کو ایک مثالی عورت کے طور پر پیش کیا ہے اور ان کی زندگی کو بنیاد بنا کر عورت کے حقوق، مقام، اور کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ شریعتی کے نزدیک حضرت فاطمہ کی زندگی نہ صرف ایک مذہبی اور روحانی نمونہ ہے بلکہ سماجی انصاف، انسانی حقوق، اور صنفی مساوات کا عملی مظہر بھی ہے۔ شخصیت کی تکمیل اور آزادی: شریعتی کے مطابق عورت کو ایک آزاد اور مکمل شخصیت کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں: عورت نہ صرف ماں ہے، نہ صرف بیوی ہے، بلکہ وہ ایک آزاد وجود، ایک مکمل انسان اور اپنے حقوق کی مالک ہے۔[19] "تعلیم اور شعور: شریعتی حضرت فاطمہ کے علمی اور فکری مقام کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عورت کو علم حاصل کرنے اور شعور بیدار کرنے کا مکمل حق حاصل ہے۔

- "فاطمہ ایک ایسی عورت ہیں جو علم، حکمت، اور روحانیت کے ساتھ سماجی اور سیاسی شعور کی حامل ہیں۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ عورت کی ترقی کا بنیادی عنصر تعلیم ہے"۔[20]

سماجی اور سیاسی کردار: شریعتی عورت کے سماجی اور سیاسی حقوق پر زور دیتے ہیں اور حضرت فاطمہ کی جدوجہد کو مثال بناتے ہیں

- "فاطمہ زہرا نے اپنے وقت کے نظام کے خلاف آواز بلند کی اور مظلوموں کے حق میں کھڑی ہوئیں۔ یہ ہر عورت کے لیے ایک پیغام ہے کہ وہ سماجی ناانصافی کے خلاف اپنی آواز اٹھائے۔"

خاندانی نظام میں عورت کا کردار: شریعتی کے مطابق عورت خاندان کا مرکز ہے، لیکن اسے صرف خاندانی زندگی تک محدود کرنا اس کے ساتھ زیادتی ہے،

- فاطمہ ایک ماں، بیوی، اور بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مثالی سماجی رہنما بھی تھیں۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ عورت کو خاندانی زندگی اور سماجی کردار میں توازن قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔

صنفی مساوات: شریعتی صنفی مساوات پر زور دیتے ہیں اور عورت و مرد کے درمیان مساوات کو ایک اسلامی اصول قرار دیتے ہیں:
فاطمہ کی زندگی یہ درس دیتی ہے کہ عورت اور مرد دونوں انسانی معاشرے میں برابر کے شراکت دار ہیں، اور ان کے حقوق اور فرائض میں توازن ہونا چاہیے۔[21]

علی شریعتی نے حضرت فاطمہ زہرا کی مثال سے یہ ثابت کیا کہ عورت کو ایک مکمل انسان، ایک آزاد شخصیت، اور ایک فعال سماجی وجود کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ ان کے نزدیک عورت کے حقوق میں تعلیم، شعور، آزادی، سماجی انصاف، اور صنفی مساوات شامل ہیں۔ یہ کتاب انقلابی انداز میں عورت کے مقام اور حقوق پر ایک بصیرت افروز بحث پیش کرتی ہے۔

خلاصہ البحث:

ڈاکٹر علی شریعتی کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے شیعت کے اندر چلنے والے عقائد اور نظریات سے بغاوت کرنے کی کوشش کی اور بعض جگہوں پر انہی نظریات کی شدومد کے ساتھ ترویج کرتے ہوئے نظر آئے بعض جگہوں پہ فلسفہ کی موشگافیوں میں اس قدر الجھ گئے کہ اپنے موقف سے بھی ہٹتے ہوئے دکھائی دیے، شریعتی خود بھی اپنے کام میں موجود بعض نقائص کو سمجھ گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے محمد حسینی بہشتی سے کہہ دیا تھا کہ ان کے مطالب میں جو قرین مصلحت سمجھیں اس کو عمل میں لائیں۔ اس لیے جہاں ان کے کام میں نقص ہے وہاں حواشی میں اس کی نشاندہی کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی عمدہ قدرت بیان رکھنے والے اعلیٰ پائے کے نفیس مقرر تھے اور قوت خلاقیت کے حامل تھے اور جو کچھ کہتے تھے دل کی گہرائی سے کہتے تھے۔ اس لیے ان کی باتیں نوجوان نسل کے دلوں میں اترتیں اور انہیں اسلام کی طرف مائل کرتی تھیں۔ انہوں نے اسلام کی تعبیر و تشریح سماجیات کے حوالے سے نئے اور جدید زاویہ نگاہ سے کی۔ فہم اسلام کے لئے ایک جدید راہ متعین کی۔ وہ روش عام سے ہٹ کر چلنے والے صاحب رائے شخص تھے۔ شریعتی کی چونکہ عمر مختصر تھی اور حالات بھی ساز گار نہیں تھے اس لیے انہیں اپنے کام کا دقت نظر سے جائزہ لینے کا موقع نہیں ملا اس لیے ان کے کام میں موجود بعض نقائص کی اصلاح و ترمیم کی ضرورت ہے۔ لیکن ان کو تاہیوں کی وجہ سے انہیں بدنام کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

حوالاجات

[1] ، دکتر علی شریعتی ، اسلام شناسی، چاپخانه طوس مشهد، 1347 شمسی،80 ـ

[2] ڈاکٹرعلی شریعتی، انسان انتشارات آگاہ تہران چاپ دوم 1993 134,

[3] ڈاکٹر علی شریعتی, هبوط در کویر انتشارات چاپخس تہران چاپ هفتم 80-81

[4] 3. محمد باقر بن محمد تقی مجلسی۔ بحار الانوار. بیروت: مؤسسه الوفاء، 1984 عیسوی ج 2 ص 32

[5] 2. علی شریعتی، ـ اسلام چیست؟ مشهد: چاپخانه طوس, 1968 74-75

[6] البقره 142/2

[7] ڈاکٹر علی شریعتی شیعه یک حزب تمام حسینیه ارشاد تہران چاپ اول 1980 61,

[8] شریعتی اسلام چیست ص ۵۰

[9] شریعتی اسلام چیست ص ۵۰

[10] علی شریعتی، *سیمای محمد* مشهد: چاپخانه طوس [1968])، 563ـ

[11] شریعتی، سیمای محمد ﷺ ، ص ۵۶۳

[12] ڈاکٹر علی شریعتی نقش انقلابی یا دو یاد آوران در تاریخ تشیع حسینیه ارشاد تہران چاپ اول 1979، ص 137

[13] محمد حسین بهشتی۔ دکتر شریعتی: جستجو گری در مسیر شدن. تہران: شمسی 199927,

[14] طباطبائی : محمد حسین فتاوای علمائے اسلام مرکز اسناد اسلامی تہران، 1991 ,ج 2، ص 202

[15] ملخص از، ڈاکٹر علی شریعتی، جانشینی اور شوری،کراچی الحرمین پبلشرز پاکستان 1998

[16] شریعتی مسئولیت شیعه بودن ص ۱۹۲

[17] شریعتی مسئولیت شیعه بودن ص ۱۸۸-۱۸۷

[18] علی شریعتی ـ بازگشت به خویشتن. تہران: انتشارات علمی، 1973ـ، 35

[19] ڈاکٹر علی شریعتی, فاطمه فاطمه ہے, کراچی :اداره احیاء تراث الاسلامی، 1993، 28

[20] شریعتی ،فاطمه فاطمه ہے، 42

[21] شریعتی ،فاطمه فاطمه ہے، صفحه 80